ڈاکٹر رضوانہ نقوی
لیکچرار، شعبہ اردو گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین جلال پور شریف، جہلم۔

عصری آشوب اور زاہد ڈار کی نظمیں

Dr Rizwana Naqvi
Lecturer in Urdu, Govt Associate College for Women Jalal pur sharif Jhelum.

The Epoch Clamour and Zahid Dar's Poems

Zahid Daar was a modern poet of new poetic era, was born in Ludhiana India in 1937 and later on migrated to Pakistan during partition. He was migrated with his family but his soul couldn't leave his birthplace and golden days of his past, so he dwell all his life in the search of lost age and time. He was so sensitive person that he couldn't walk with society and remains unchanged to adopt the new pattern of materialistic life. He confined himself in his Utopia but couldn't get rid of from the sufferings of humanity, in this way his poetry in the form of blank verse becomes the sigh & cry of tumultuous society. Melancholia is the basic element of his poems. There are many reasons of human sadness, on the one side industrialism is attacking the humanity, while on the other side there is unfavourable social sentimental situation and its created violence, the third angle is under the fetter of traditions. So, in his poems the man who is going to present by him interject the clamour of modern society and has no way for the compatibility. Zahid Daar considers that the ignorance, oppression and ferrate clamp of traditions are the main inducer of social suffering. So in his poems he tries to find the ways for the security of man's inner and outer self but can't succeed inspite of cultural restoration. This article throws the light upon the basic elemnt of his poetry which is social unrest & riot.

Key Words: *Materialistic life, tumultuous society, melancholia, fetter of traditions, operession, social sufferings.*

محمد حسن عسکری کے "سات رنگ" میں "مادھو" کے نام سے شناخت جانے والے زاہد ڈار نئی نظم کا ایک منفرد حوالہ ہیں، نئی نظم استعاراتی معانی کے گنجلک سلسلوں، شعری تجربات کی پیچیدگی، معنی کے غیر رسمی تصور،

شعری و لسانی ابہام اور زبان کی توڑ پھوڑ کے باعث جہاں ہدفِ تنقید بنی وہیں زاہد ڈار کی نظموں کا رواں، سادہ و سہل اسلوب داد و تحسین کا مستحق ٹھہرا۔ ۱۹۶۴ میں منظرِ عام پر آنے والا ان کا پہلا شعری مجموعہ "درد کا شہر" جہاں ہم عصر" نئی شاعری" کے خلاف ایک ردّ عمل بنتا ہے وہیں اس کی اشاعت نئے شعرا کے اس موّقف کی تائید بھی کرتی ہے کہ نئے شعرا کی شاعری فارمولا نہیں ہے بلکہ نئی شاعری کی تحریک سے وابستہ شعرا کی فنی انفرادیت انہیں ایک دوسرے سے متمیز کرتی ہے۔ "ان میں ذہنی اشتراک کا جواز اس صورتحال کا ادراک ہے جس میں اقدار کی شکست و ریخت کے عمل میں انسان لاوارث ہو چکا ہے اور کائنات کی ساری سختیاں اس کا مقدر بن گئی ہیں۔ اس کے ذہن کی منتشر اور نراجی کیفیت نے اسے حال میں موجزن حقائق کی اطاعت پر مجبور کیا ہے، اسے اپنے اور دوسروں کے لئے ضابطہءِ حیات کی ضرورت ہے ۔ ہر نئے شاعر نے اپنی صلاحیت اور طبائع کے مطابق اپنے زمانے کی جذباتی اور متصادم صورتحال کی شناسائی اور اس تک پہنچنے کے لئے مختلف ہیئتیں تخلیق کی ہیں"(۱)

زاہد ڈار کی نظموں میں بھی معاملات و مسائل کی نوعیت عصری صورتحال سے جنم لیتی ہے۔ اور معاشرتی حیات کی بے ترتیبی و ابتری مجموعی انسانی صورتحال کا مرقع بن کر ابھرتی ہے۔ یہ نظمیں ان کی اپنی ذات کا قصہ بھی ہیں اور ملکی اور عالمی سماج کا آئینہ بھی، بے خودی و بیگانگی کے یہ قصے ان کی اپنی سرگزشت بھی ہیں اور اِک عہد کا نوحہ بھی اور اس انفرادی و اجتماعی کرب کی سرحدیں آپس میں متصّل ہیں۔ ان کا فن انفرادی و اجتماعی عصری صورتحال کا عکاس ہے جس میں تکرار بھی ہے اور تغیر بھی، کیونکہ یہ ایک خاص ملکی اور تمدنی صورتحال کا نتیجہ اور ان کی اپنی شخصیت اور معاشرتی فرد کے ذہن اور ماحول کے درمیان مقام اتصال ہے۔ اور یہ اتصال زندگی کی مروجہ مگر کھوکھلی اقدار سے انفرادی و اجتماعی ہر دو سطح پر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ایک شدید جذباتی بحران کو احتجاج کی صورت سامنے لاتا ہے، یہ احتجاج وہ جذباتی ردّ عمل ہے کہ جس کا شکار سماج کا ہر حسّاس انسان ہے۔ آج کا انسان آج کی تہذیب اور آج کا نظام گو کہ طبقاتی تقسیم میں ماضی کی دو دنیاؤں کا ہی اعادہ ہے مگر اس تقسیم کی بشری حساسیت ماضی سے کئی گنا زیادہ ہے اور عہدِ حاضر میں جہاں انسانی حقوق و عظمت کے نعرے لگائے جاتے ہیں صورتحال کی تبدیلی محض ایک وہم ہے۔ انسان کی ذات ایک ہی ہے مگر زیست کو طے کرنے راستے دو، حیات گویا مرنے سے پہلے ہی پلِ صراط ہے کہ جس کے ایک طرف نعمت ہے اور دوسری طرف حسرت، ایک طرف دینے والا ہے، اور دوسری طرف لینے والا، مگر دونوں ہی غیر مطمئن، مضطرب اور خوفناک ہیں، ہر دو کے درمیان تشنج کی رسی تنی ہوئی ہے مگر فرق یہ ہے کہ لینے والے کی صورتحال کربناک و تشویشناک ہے۔ اس کی زیست میں تشنج کی صورت حال دینے والے کی پیدا کردہ ہے۔

کیونکہ تمام وسائلِ حیات اسی کی دسترس میں ہیں اور وہی مؤخر الذکر کے لیے حیات کے قرینے اور شرائط مرتب کرتا ہے۔ زندگی کی بوقلمونی اور سکون لینے والے کی دسترس سے باہر ہیں۔ وہ بھی حیات سے اپنے حصّے کی خوشیاں اور زمانے سے اپنی زندگی چاہتا ہے مگر اپنے معاشرتی اور تاریخی رول کی بدولت مجبور ہے۔ وہ اس محاصرے سے باہر نہیں نکل سکتا چناچہ وہ انسانوں کے جنگل میں اجنبی و تنہا اپنی زیست کو لاحاصل جانتے ہوئے زندگی کا نیا قرینہ چاہتا ہے ، مگر ناکام رہتا ہے ایسے میں وہ اپنی حیات کو بے وقعت گردانتے ہوئے حیات کا جو قرینہ ترتیب دیتا ہے وہ قرینہ ترتیب سے زیادہ تخریب اور تفکر سے زیادہ ردِّ عمل کا نتیجہ ہے۔

"رحمِ مادر سے نکلنا میرا بے سود ہوا
آج بھی قید ہوں میں
حکمِ مادر کو میں تبدیل کروں۔۔۔۔۔۔
بے نیازی سے پھروں
پاپ کے کانٹے چن کر
روح ناپاک کروں
گیت شہوت کے 'ہوس کے چن کر
ذہن بے باک کروں
ایسے جیون کی ہے حسرت اب تک [۲]

بشری و سماجی سطح پر انسان کے جذباتی و نفسیاتی تصادم کی' داستان'زاہد ڈار کی یہ نظمیں عصری صورتحال سے متعلق تشویش کو دیگر نئے شعرا کی نسبت سادگی سے PAINT کرتے ہوئے۔، جس داخلی کشمکش کو بیدار کرتی ہیں اس سے متعدد استفسارات پیدا ہوتے ہیں۔ جو خود انسان کی ذات کے حوالے سے بھی ہیں اور ماضی و حال کی اقدار کے حوالے سے بھی۔ عہدِ حاضر کا انسان آزادی کے نام پہ زر کا غلام ہے، زر کی اس غلامی نے جہاں اجتماعی حیات کو کھوکھلے پن کے سپرد کیا وہیں انفرادی طور پر بشری حیات میں نفسیاتی الجھنوں اور خلاؤں کے راستے دراز کیے، جس نے انسانی اخلاق، اور تہذیبی حیات کے سوتوں خشک کر دیا اور انسان بدی، شرّ اور سستی جذباتیت کے رنگوں سے رنگا گیا۔ بڑھتی ہوئی استعماریت، طبقاتی تصادم، ہوسِ زر نے جدید حیات میں جذبے اور فکر دونوں کو کمیاب و بے وقعت کر ڈالا تھا ، تقسیم ہند کے حادثات اور اس کے بعد کی پیدا شدہ صورتحال میں اقتصادی ڈھانچے کی شکست و

ریخت اور معاشی پسماندگی نے ہمارے سماجی انسان کو اک مسلسل اضطراب کے حوالے کیا، احساسِ بے بسی داخلی و خارجی گھٹن کے باعث دم گھونٹتا تھا، معاشی، تہذیبی، معاشرتی و فکری طور پر شعرا وادبا کی شخصیات ریزوں میں بٹ چکی تھیں (جس کے مظاہر ادب و شعر میں جابجا نظر آتے ہیں)احساس، خیال و جذبوں کے پرانے قرینے منتشر و شکستہ تھے، معروضی حقائق پاش پاش اور بے محلی کا احساس حد سے سِوا تھا اس پہ مستزاد مغربی سماج کے جدید تصورات نے احساسِ کمتری و حسرت کے ساتھ ساتھ انتشار و افراتفری کو بھی جنم دیا۔ صنعت و سائنس کی ترقی، نئے علوم کی روشنی و فکری دریافتوں نے اس مذہبی و مابعد الطبیاتی تشکیک کو دوچند کیا کہ جس کا آغاز عہدِ سرسید سے ہو چکا تھا۔ صدیوں کا پروردہ مابعد الطبیاتی نظام واقدار عہدِ جدید کے مشینی و میکانکی پھیلاؤ کے باعث جس ردّ و انتشار کی زدّ میں تھا اس کا اظہار زاہد ڈار کے ہاں بشر کی داخلی و خارجی کشمکش، عدمِ یقین، تشکیک و کرب کے لمحوں میں ماضی سے علیحدگی کی صورت نمودار ہوتا ہے لیکن ماضی کو یکسر ردّ کرنے کا رجحان ان کے ہاں موجود نہیں بلکہ ماضی کی اقدار کی نفی ان بھیانک نتائج کی مرہونِ منت ہے جس سے آج کا انسان دوچار ہے۔

سنو ماضی

دھواں تھا، اڑ گیا، واپس نہ آئے گا
گذشتہ عظمتوں کی راکھ پر آنسو نہ بہاؤ
سنو گزرا ہوا کل ڈوبتا سورج تھا، آندھی تھی
ہوائیں اور بھی آئیں گی آئندہ
نئے سورج بھی ابھریں گے (۳)

ان کے ہاں ماضی سے دوری دیگر شعرا کی نسبت انتقام و ہنگامے سے زیادہ حال کی عدمِ مطابقت کو گوارا کرنے کی اک کوشش ہے۔ وہ انسانی ذات و حقائق کی تشکیل گزرے ہوئے کل کی مٹتی ہوئی صورتوں و عظمتوں کے کھنڈرات پہ کرنے کی بجائے آنے والے کل کی امید پہ رکھتے ہیں مگر عہدِ حاضر کا منظر نامہ انہیں نراش کرتا ہے ان کی نظموں کی شعری تشکیل میں شہر ایک محدود استعارے یا حیاتیاتی تضاد کے بیان سے آگے بڑھ کر ایک وسیع تناظر کے طور پر نظر آتا ہے۔ جس میں طبقاتی تقسیم، منافقانہ رویے، نیکی و بدی کے دوہرے معیار، انفرادی و اجتماعی خود غرضی و مفاد کے لیے مذاہب و عقائد کا کاروبار، شہروں کی تاجرانہ فضا میں ہر نوع کے مال و جنس کا نیلام عام، بشر کی محرومیاں، ہزیمتیں، صنعتی مقاصد اور حصولِ زر کے لیے ہر لحظہ جاری کشمکش بہت واضح نظر آتی ہے اور اِک نئے

اسلوب کے تحت اپنی معنویت آشکار کرتی ہے۔ شہروں کی اسی فضا میں بشر کی کسمپرسی و عیاری کے متعدد روپ، حصول معاش، جوانی و خونی رشتوں کے باہمی منافقانہ رویے اور سیاسی چالیں چاروں طرف بچھی محسوس ہوتی ہیں اور شاعر اس دانستہ داروجبر کے درمیان انتخاب و آزادی کی قدر و قیمت کے معنی پہچانتا ہے اور یہیں سے تنہائی اور اجنبیت بر آمد ہوتے ہیں اور ان کی شعری کائنات پہ چھا جاتے ہیں، تنہائی جہاں عہدِ حاضر میں تصادم کا المیہ ہے وہیں یہ تنہائی زاھد ڈار کی ذات و شناخت کا استعارہ بھی ہے۔ حال کی میکانکی جبریت نے اقدارِ انسانی کو کچھ یوں مسخ کر دیا تھا کہ انسان، انسان کو شناختنے سے عاری تھا نئے دور و نئے رویوں کے سیلِ بلا میں انسانی مجبوری و بے بضاعتی زاہد ڈار کے ہاں تنہائی کے ساتھ ساتھ بیگانگی کے جس رویے کو جنم دیتی ہے وہ انہی سے مخصوص ہے۔ لیکن ان کے ہاں بیگانگی کا تصور مروجہ اصطلاح یعنی ہیگل اور مارکس کے متعین کردہ معنوں سے دور ایک عظیم تہذیبی و تخلیقی واردات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ شمیم حنفی کے بقول:"ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہیگل کے یہاں بیگانگی کے مضمرات عمرانی اور نفسیاتی تھے، مارکس کے یہاں سیاسی و اقتصادی۔ زاہد ڈار کی کتاب" درد کا شہر" جس وقت شائع ہوئی، لگ بھگ انہی دنوں ادب میں بیگانگی کا میلان ہماری تنقید کا مسئلہ بنا۔ لیکن کیا ترقی پسند کیا جدید، زیادہ تر ادیبوں نے اس سے وہی مطلب نکالا جس کا سبق ہیگل اور مارکس پڑھا چکے تھے۔ ایسوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے بیگانگی کے تجربے کو ایک بڑی تہذیبی اور تخلیقی واردات کے طور پر قبول کیا ہو۔ ان میں بھی زاہد ڈار الگ سے پہچانا جاتا ہے۔ بعضوں کے یہاں یہ واردات ملتی بھی ہے تو مجموعی حسّیت کے بس ایک عنصر کی شکل میں۔ یہ عنصر حسّیت کی اساس نہیں بنتا"۔(۴) زاہد ڈار کی نظموں میں بیگانگی کا میلان دراصل مظاہرِ کائنات اور بشری حسّیت سے گہرے جذباتی ربط کا حاصل ہے، جس بے ریا زندگی اور عناصر کے حسن سے مالامال دنیا کی تصویر تجربے کے بنیادی محور کی صورت ان کی نظموں سے ابھرتی ہے، وہ دنیا ان کے لئے صرف پناہ گاہ نہیں ہے مادی دنیا کی کثافتوں کے خلاف روح کے احتجاج کا وہ انداز جو رومانیوں سے مخصوص تھا، ان نظموں سے ایک جہت اس احتجاج کی بھی نکلتی ہے[۵]۔ لیکن اس سے ان کی حقیقت پسندی کو ٹھیس نہیں پہنچتی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظموں کے سانچے، اخلاقی حزن والم سے منسلک بیگانگی کے رویے اور نیم درویشانہ آہنگ اپنے قاری کو داخلی و خارجی حوالے سے از سرِ نو اپنی تاریخی ترجیحات و عمل کے احتساب پر مائل کرتے ہوئے انسانی سماج کی جہتِ نو مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں۔

وقت کے دریا میں لہروں کی طرح بہتے ہیں ہم
کرب میں تنہائی میں
کس کا اب ڈھونڈیں سہارا
کس کی اب مانگیں پناہ
کونسی ہے ذات جس کی ذات میں
اپنی ہستی کو ڈبو کر روح کو اونچا کریں
امن اور آسودگی پائیں کہاں
روشنی پائیں کہاں۔(۶)

کرب و تنہائی میں روشنی و سہارے کی کھوج دراصل بکھرتی ہوئی حیات کو سنبھالنے کا حیلہ ہے ،حیاتیاتی ابتلا میں پھنسا وجود اپنے ہونے کا یقین چاہتا ہے اس یقین کے حصول کے لئے عرفانِ ذات کے ساتھ ساتھ تحصیلِ ذات کا مسئلہ بھی زاہد ڈار کی نظموں کا محور بنتا ہے۔ فکر و وجدان کے نئے زاویے تنہائی میں کھلتے ہیں۔ زاہد ڈار کا تصورِ تنہائی زندہ رہنے کی مجبوری سے جنم لیتا ہے، انہیں عہدِ حاضر میں کوئی ایسا نظریہ، نظام یا شخصیت دستیاب نہیں جو انسانی آسودگی و فلاح کی نوید ہو سوانیس ناگی کے بقول "روشنی و امن کی تلاش اس تصادم سے نجات کی خواہش ہے جو شاعر کے اضطراب کا محرّک ہے۔"(۷)

ان کی نظمیں محض عہدِ حاضر کی کشمکش و ہولناکی کی تصویر ہی نہیں اس تلاش کی بھی کہانی ہیں جس میں بشر اپنی جڑوں تک پہنچنے کے عمل میں جوکھم اٹھاتا ہے اور تماتر مایوسی کے باوجود امید کی ننھی سی کرن دل میں سنبھال رکھتا ہے۔ زاہد ڈار کی بیشتر نظمیں گفتگو کا پیرائیہ اختیار کرتیں، اشارات سے ترتیب پا کر ایک تفصیلی بیان کا نمونہ بن جاتی ہیں کہ جہاں شاعر اپنے مافیہ کا اظہار کھل کے کرنا چاہتا ہے "درد کا شہر" کی نظموں کے علاوہ دیگر مجموعوں کی نظموں میں بھی فکری، موضوعاتی اور حسّیاتی سطح پر معاصر عہد کے تہذیبی و تمدنی انتشار اور اس انتشار میں گھرے فرد کو focus کرنے کی کوشش کامیاب ہے۔ ان کے ہاں نظموں کی صورت انتشار و زوال کا یہ قصّہ عصری حسّیت کا غماز ہونے کے باوجود تغیر، انقلاب اور مساواتِ انسانی کی خواہش میں مفروضوں اور نعروں سے دور، زندگی کی تفسیر مختلف حقیقی و داخلی حوالوں سے کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں معاشرے اور فرد دونوں کا چہرہ مادیت پرستی اور

انسانیت کے بدن کا ناسور ہے جس کا علاج گو کہ ممکن نہیں کیونکہ اس ناسور کا محرک خود انسان کی ذات ہی ہے لیکن وہ پھر بھی حال کے لمحوں کی عافیت اور انسانی مستقبل کی بہتری کے خواب دیکھتے ہیں۔

من میں ایک چبھن کا احساس جنم لیتا ہے
ایسی بات کریں جو سارے جگ کو بھائے
ایسی چیز بتائیں جس سے آشا شکتی پائے
ایسا کام کریں کہ دنیا سے نفرت مٹ جائے(۸)

انیس ناگی کے مطابق "یہ زاہد ڈار کی جذباتی سادگی ہے کہ وہ آج کے متحارب و متصادم دور میں دوستی اور انسانی محبت کے گیت گاتا ہے کہ اس سے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے "(۹) لیکن کیا کیا جائے کہ دوستی اور محبت کے یہ سارے لطیف سر منافقت، خوشامد، ابن الوقتی اور غلبے کی اندھی خواہش کی نذر ہوتے ہیں اور عہدِ حاضر کے انسان اور اس کے مصائب کے گونا گوں روپ سامنے آتے ہیں۔ نوحے میں ڈھلتا تیسری دنیا کا اسفل ترین انسان مشرقی افق سے پھوٹتی شعاعوں سے محروم تاریک راستوں پہ محوِ سفر معروضی تناظر میں ماضی کی روایتوں کو تج کرنے کے بعد مسخ شدہ ذات کے کرب میں لمحہ لمحہ عذاب سہتا ہے مگر حیات کی بے معنی طوالت بڑھتی چلی جا رہی ہے، اسی بنا پر ان کی نظمیں عہدِ حاضر کی سیاسی و سماجی صورتحال کے پیدا کردہ جبر اور اقدارِ انسانی سے پہلو تہی کرتے معاشرے کا نوحہ بن جاتی ہیں، ایسا نوحہ کہ جہاں ان کا شعری رویہ خود کلامی سے بھی مشابہہ ہے، خود کلامی کے ذریعے شاعر ہر نوع کے غصّے، شک ہیجان، نفرت، تدبیر اور مشّیت کو واقعات سے منسلک کر کے معنی آفریں بناتا اور نو آبادیاتی سماج کی تصویری کہانی کہتا ہے۔ کہ جہاں وہ ازلی اجنبیت کا مقسوم لیے، اپنی نسلوں کو بے ثمر زمانوں کی کھوج پہ دیوانہ وار مائل زندگی کی حقیقتوں اور بصیرتوں سے تہی ہوتا دیکھ رہا ہے، ایک کھوئی ہوئی صدا کی طرح، تمام موسموں میں، تمام عارضی سلطنتوں کے راستے سے گزرتے ہوئے، خالی آنکھوں سے زیست کی دھجیوں کو حوادث کی یلغات میں بکھرتا دیکھ رہا ہے۔

اب کے اس طور سے بکھرے ہیں حواس
کوئی ترتیب نہیں
ایسا لگتا ہے کہ صحرا ہے کوئی
دور تک پھیلی ہوئی ریت کو جب دیکھتا ہوں

میری آنکھوں میں وہی پیاس چھلک آتی ہے
روح کی پیاس چھلک آتی ہے
زندگی میری دھوئیں کی صورت
پھیلتی اور بکھر جاتی ہے
پھر ہوا وقت کے ہاتھوں میں ہے تلوار کی مانند رواں،
پھر میں مرتا ہوں، فقط موت مجھے بھاتی ہے۔ (۱۰)

موت سے یہ لگاؤ اور خود کے مٹنے کا یہ احساس دراصل اپنے ہونے کے شدید احساس کا نتیجہ ہے، یہ کیفیت ان کے ہاں ذات کی داخلیت کو ایک وسیع تر کل میں منتقل کرتے ہوئے انسانی وحشت کا قصّہ کہتی ہے کہ جو آج کے انسان کا مقدر بنتی جا رہی ہے۔ خود اختیاری یا غیر اختیاری وطن بدری انسانی مصائب و مشکلات کا حل نہیں۔ کیونکہ داخلی صورتحال معروضی صورتحال پہ بہرحال بھاری پڑتی ہے۔ مگر آج کا بشر اپنی زندگی کی خوشگواریت اور اپنی موجودہ کربناک صورتحال کو بدلنے کے لیے خود کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ کسی صورتحال سے نجات کے لیے ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے مقام پر ٹھکانہ کیا جائے تو عافیت ممکن ہے۔ مگر صورتحال اس کے برعکس ہے کیونکہ ذاتی احساسات و کیفیات جو کسی بھی مثبت یا منفی صورتحال کو جنم دیتے ہیں وہ تو بشر کی اپنی ذات سے متصل ہیں نہ کہ مقام سے۔ چنانچہ خود ان کی طرح ہر بشر مقامیت کے خوف میں قید، ڈرا، سہا ایک دوسرے سے اجنبی اور بیگانہ اپنی چاردیواری میں قید، مہربلب خود کو فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اسی بنا پر کرکے گور نے کہا تھا کہ ذات وہ دروازہ ہے کہ جس سے صدیاں اور زمانے گزرتے ہیں۔ ۱۹۳۶ لدھیانہ میں جنمے زاہد ڈار ۱۹۴۰ کی اپنی خاندانی ہجرت کے کرب سے تاحیات دور نہ ہو سکے۔ اور اسی کرب کے دھاگے سے بندھے وہ ایک بار بغیر ویزے کے اپنے پرانے گھر لدھیانہ جا پہنچے، واپسی پر پاکستانی فوج کے ہاتھوں جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوئے اور کچھ عرصہ کی قید کے بعد رہا ئی ہوئی (۱۱) مگر زمینی اور زمانی ہجرت کے کرب کی یہ چکّی انہیں تاحیات پیستی رہی ان کے نزدیک "تقسیم کے وقت ہم لوگ لدھیانے سے لاہور آ گئے تھے لیکن اصل ہجرت وہ نہیں تھی ہجرت تو بعد میں شروع ہوئی جو اب تک جاری ہے، وہ ماحول جس میں میں پیدا ہوا تھا اب نہیں ہے ماحول مسلسل تبدیل ہو رہا ہے، ویسے تو بچپن میں بھی اپنے آپ کو دنیا میں اجنبی ہی محسوس کرتا تھا لیکن اس کے بعد اجنبیت کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا رہا ہے (۱۲) چنانچہ ان کی نظموں میں بشر محض ذات کے جبر و حالات کا قیدی نہیں بلکہ ایک لامختتم اداسی، جلاوطنی اور دربدری سے دو

چار ہے یہ وطن بدری اس کی خود اختیاری بھی ہے اور زمانے کے حوادث کا نتیجہ بھی۔ ان کے ہاں غریب الوطنی کا احساس جس شدت اور کلیّت سے اُبھرا ہے اس کی مثال اردو نظم میں کسی دوسرے شاعر کے ہاں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اپنے جیسے "معمولی" آدمیوں کو ٹھوکریں کھاتے انہوں نے نہایت قریب سے دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ سماج کے ان "Miss Fit"، لوگوں کے دکھوں کو اپنی دھڑکنوں میں محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صائمہ ارم کے مطابق: "جسے انتظار حسین نے ایک فالتو آدمی اور جسے خود وہ ہمیشہ ایک معمولی آدمی پکارتا رہا وہ دراصل ایک ہمہ وقت دستیاب آدمی تھا۔ زاہد ڈار نے سورج بجھنے کی پیشین گوئی مارچ ۱۹۶۵ میں چھپنے والی کتاب میں کر دی تھی اور مرنے سے پہلے اسے سچ ہوتے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ محبت کرتے تھے اور مایوس رہتے تھے۔ ان کی نظمیں معمولی آدمی کی نظمیں ہیں، بانجھ پن کا شکار ہوتی زمین کا نوحہ ہیں۔ تیسری دنیا کی غریب اقوام کا سیاست نامہ ہیں۔ ایک تنہا شخص کی بے سروسامانی کا قصہ ہیں۔ ایک تھکتے بدن کی دکھی روداد ہیں۔ وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت دیکھنی ہو تو زاہد ڈار کو دیکھئے۔ زاہد ڈار البرٹ کامیو کی متھ آف سسی فس کی تجسیم تھا۔ ABSURDITY پہ لوگوں نے لکھا لیکن زاہد ڈار نے اسے برتا اور جیا ہے۔"(۱۳)

اب کا ماحول مجھے راس نہیں
برسوں پہلے یہ زمیں
صاف شفاف تو نہ تھی لیکن
رات اور دن
رات اور دن ہوتے تھے، کچھ اور نہ تھے
اب تو دن رات مجھے
چند بے کار سے لمحوں کا الجھاؤ نظر آتے ہیں
رات بھر جاگتے رہنے سے نگاہوں سے جو پانی نکلا
زہر ملا
ایسے پانی سے بھلا داغ کہاں دھلتے ہیں
دن چڑھے چاند پگھل جاتا ہے، امید کے پر گھلتے ہیں(۱۴)

زاہد ڈار کی شعری مورت عہدِ موجود کے مظلوم اور کٹی پھٹی شخصیت والے انسانی fresco سے ترتیب پاتی ہے۔ ان کے شعری سلسلے کی تمام تر لڑیاں "ذات" کے وسیع تر تشخص کے سلسلے دراز کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ذاتِ انسانی ہی تمام تر حقیقتوں کی حقیقت ہے اور حیات کے سارے دھارے اسی سے پھوٹتے ہیں۔

تم میری اور اگر دیکھو تو
شہر کی رات کی رونق' رستے
لوگ' آوازیں' نگاہیں' بجلی'
ایک ہی شعلے میں جلتا ہوا سارا عالم'
درد' تکلیفیں' مصائب' چیخیں'
سب نظر آئے گا' سب کچھ' سب کچھ
تم میری اور اگر دیکھو تو(۱۵)

وہموں اور بے اعتقادی کے گرداب میں غلطاں حقیقت کے احساس و ادراک کا یہ تصور بکھرتے ہوئے انسان کو سماج مرکزیت عطا کرتے ،احساسِ دردمندی کی ذمہ داری شاعر کے سپرد کرتا ہے اور اسی احساسِ ذمہ داری سے ان کا تصورِ اخلاق جنم لیتا ہے اور وہ کسی قبل از وجود نظامِ اخلاق کو قبولنے کی نسبت خود احتسابی کی طرف رجوع کرتے ہیں' ان کی آنکھوں میں ہزار راتوں کا جاگتا ہوا درد آگہی کے نشے میں اعصاب کی طنابوں کو کھینچتا اپنی ذات سے پیدا ہوتی آگہی کی مثال ترتیب دیتا ہے۔ خود آگہی اور سماجی صورتحال کا ادراک ان کے ہاں شعوری کاوش کے باوجود لاشعوری انداز میں نظر آتا ہے ۔ وہ بشری عوامل کی کائنات میں ہر حقیقت کو اپنی ذات کے آئینے میں منعکس کرتے حقیقت کی ہمہ جہت صورت سامنے لانے کی سعی کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک سب سے بڑی حقیقت ان کی اپنی ذات ہے جس کے وسیلے سے وہ مظاہرِ حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور بشر کو انسان و فرشتے، نیک و بد کے محدود دائرے میں مقید کرنے کی بجائے عصر کی صورتحال اور اس صورتحال کے تناظر میں اس کی متنوع صورتیں، اعمال اور شناخت کو متشکل کر کے بشر کے ذریعے زمانے کا قصّہ کہتے ہیں ان کے ہاں فرد کا کردار مروجہ اور ماضی کی نظم وغزل کی روایت سے منفرد ہی نہیں ہمہ گیر بھی ہے عہدِ موجود میں محکوم معاشروں کی صورتحال اور فرد کی حقیقت ان کی نظموں میں ایک داستان کی طرح بکھری ہے۔ وہ فرد جو تنہا ہے، بدلے ہوئے مزاج کے شہروں میں مس فٹ ،زر پرست معاشرے میں کھوکھلی اقدار اور معیارات کے درمیان پستا ہوا وہ تنہا بشر اپنے جیسے ان گنت کرداروں کا

استعارہ بنتا ہے۔ شناخت کی گمشدگی، بے ہیئت زیست میں بے سہارا زندہ رہنے کا جبر، سماج کی منفی قوتوں کا اقتدار، عقیدوں و روایتوں کا کھوکھلا پن لامحالہ طور پر تنہائی، عدم تحفظ اور جنسی محرومی کے باعث بشر میں جس نراشی کیفیات کو جنم دیتا ہے وہ فکری و شعری حوالے سے وجودیت کو تحریک دیتا ہے اذیت اور کشمکش سے دوچار وسوسوں میں گھری ذات ادراک و احساس کا وہ زاویہ ہے کہ جس کے وسیلے سے تاریخِ انسانی کے تجربات و سانحات کو بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ زمیں'یہ آسماں'یہ کائنات
ایک لامحدود وسعت'ایک بے معنی وجود
آدمی اس ابتری کی روح ہے
آدمی اس مادے کا ذہن ہے
ابتری اور انتہا
مادہ لاانتہا
آدمی محدود ہے
آدمی کا ذہن بھی محدود ہے
آدمی کی روح بھی محدود ہے
یہ زمیں، یہ آسماں یہ کائنات
جبر کا اک سلسلہ
کس طرح سمجھوں اسے
کرب ہے اور روح کی تنہائیاں
زندگی کے ختم ہو جانے سے پہلے
راز پاسکتا نہیں
اور جب مر جاؤں گا
راز کا اک جزو بن جاؤں گا میں
تب مجھے ڈھونڈے گا کون

آہ یہ لاچارگی یہ بے بسی
ایک لامحدود وسعت، ایک بے معنی وجود
یہ زمیں یہ آسماں یہ کائنات (۱۶)

زمیں و زماں کی یہ بے کرانی فرد کو اور بھی بے وقعت و بے مایہ کرتے ہوئے اسے تہ دامانی اور لامحدود خلاؤں کے سپرد کرتی ہے۔ دراصل زندگی سے ربط و ضبط کے سلسلے دراز کرنے کے لئے فرد کے لئے مثبت اقدار اور مصدقہ رویوں کی قبولیت ضروری ہے جن کی موجودگی بشر کو ایک "آزاد وجود کے طور پر شناخت عطا کرتی ہے۔ مگر عہدِ حاضر میں ایسا ممکن نہیں وجودی نقطہ ءِ نظر سے انسان ہمیشہ ایک نوع کی تہی دامانی کا شکار خود کو خلا میں محسوس کرتا ہے۔ یہ تہی دامانی زیست کی نارسائیوں اور مجبوریں کے بطن سے نمودار ہوتی ہے فرد ہمیشہ اس "خلا" یا تہی دامانی سے چھٹکارے کا خواہاں ہے۔ مگر عہدِ حاضر میں تریاق کی ہر بوند بے کار اور ہر کوشش لاحاصل ہے۔

زاہد ڈار خود شناختی کے عمل میں لسانی سطح پر مروجہ ادبی زبان سے قریب ہونے کے باوجود موضوعاتی اور تفہیمی حوالے سے مروجہ ادبی روایت سے دور ہیں ان کی نظموں کا متن جتنا فہم سے قریب ہے مکمل دسترس میں اتنا ہی دور ہے۔ ان کی نظمیں بشری صورتحال کی دستاویز ہیں کہ جس میں سیاسی، سماجی و جسمانی آشوب و ابتلا میں گھرا انسان نت نئے روپ میں سامنے آتا ہے۔ انسانی ابتلا و آزمائش کی یہ گھڑی ٹلنے پہ نہیں آرہی، اس نے شہروں کی رونق و رنگت چوس لی ہے اور بدلے میں انسان کو ایک ناآسودہ، بدحال، سپاٹ اور بے رنگ زندگی تھما دی ہے۔ ان کی متعدد نظمیں اِک ایسے حساس، بے ریا، اور گرداب میں پھنسے بشر کا اظہاریہ بھی ہیں کہ جو اپنے لبوں کو سینے سے قاصر دوسروں کو بھی اپنے داخلی و خارجی تجربات اور جذباتی وارفتگی، ماحولیاتی و زمینی تبدیلیوں کے بھیانک نتائج میں شامل کرنے کا خواہشمند ہے۔ ان کا غالب رحجان پُر آشوب عصری صورتحال اور اس کے زائیدہ شوریدہ سر، منتشر الحواس، بے بس اور بے ٹھکانہ انسان کی بکھری ہوئی اور بے کیف زندگی کا بیان ہے۔

جس دن میرے دیس کی مٹی
کومل مٹی
پتھر بن کر
محلوں اور قلعوں کے روپ میں ڈھل جائے گی
اس دن گندم جل جائے گی

جس دن میرے دیس کے دریاؤں کا پانی
ٹھنڈا پانی
بجلی بن کر
شہر کی کالی راتوں کی زینت کا سامان بنے گا
اس دن چاند پگھل جائے گا۔[۱۷]

ان کی نظموں کا انسانی پیکر شکستوں سے چور، حال کے لمحوں میں اذیتوں سے گھائل، بے کلی و بے یقینی کی سرحد پہ کھڑا اپنے حوصلوں کو جانچ رہا ہے۔ اس بشر کی ذات سے منسلکہ خوف، لذت، حوصلے اور پریشانی کی متعدد تصویریں شاعر کے شعری ایوان میں متحرک سماجی فرد کی نمائندہ بھی ہیں اور خود شاعر کی ذات کا عکس بھی۔ ان کے ہاں بشری دکھوں کو جینے کا عمل درحقیقت اپنے ماضی اور اپنی تہذیب کو جینے کا عمل ہے۔ ان کی شاعری میں ایک عجیب و غریب کرب فروغ پا رہا ہے اور اپنی حقیقت اور کہنہ کے نامعلوم ہونے کے معاشرتی ماحول اور نظام کے غیر صحتمندانہ عناصر کی وجہ سے المیہ کیفیات شدید کرب و بے بسی کی صورت اختیار کرتی ہیں سو یہ بے بسی سماج کی ٹھوکروں سے بے حال جائے پناہ ڈھونڈتی ہے۔ بشر خاک کا پتلا سہی مگر عہدِ حاضر میں وہ زیست کے رستے پر اُڑتی دھول کے خاکے بن گیا ہے۔ سارے چہرے، ہونٹ اور ہاتھ بے نشان معلوم ہوتے ہیں۔

اس بستی کی سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
اس بستی کی گلیوں کے ناموں میں نیکی اور بدی کا نام نہیں
سیدھے سادھے نام ہیں جیسے: لالچ، غصہ، بھوک، محبت، نفرت
سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
شہر نہیں ہیں، چاروں جانب شور ہی شور ہے، کیا ہے
گہرے شہروں میں رہنے سے عظمت کا احساس مٹا
لمبے حملوں پر جانے کا، قدرت سے ٹکرانے کا ارمان مٹا
اب آرام ہے شہروں میں انسان مٹا[۱۸]

زمانۂ حال کا صنعتی طرزِ حیات جن منفی قوتوں کو پروان چڑھا رہا ہے اس نے نئی تہذیب کو بد شکل بے معنی و بد ہیئت کر دیا ہے اسی بنا پر زاہد ڈار نا صرف صنعتی اسلوبِ زیست سے تنفر کا اظہار کرتے ہیں بلکہ انسانی حیوانیت

کا نقاب بھی نوچتے ہیں کہ جس کے لیے قتل و غارت گری اور خون کی سرخی، کھیل اور رنگ سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

" آدمی کے لیے شور اور رنگ میں
قتل و غارت، تباہی میں اور جنگ میں
جو کشش ہے
اس کا کوئی اُپائے نہیں۔(۱۹) "

عہدِ جدید کے انسان کا کرب زندہ رہنے کی مجبوری کا پیدا کردہ ہے۔ زاہد ڈار کے نزدیک عہدِ حاضر میں کوئی ایسا نظام، شخصیت و نظریہ موجود نہیں جو بشر کی آسودگی کا بار اٹھائے۔ سماج کے مصائب و اذیتوں کا محرک وہ ظلم، جہالت و روایت کی آہنی گرفت ہے جس نے انسان اور سماج کی آزادی کو مقید کر کے دائمی قید سے دوچار کر رکھا ہے۔ چنانچہ زاہد ڈار دو راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ صنعتی کلچر کے ظلم و جبر کو رد کر کے اس کے خلاف مدافعت کی جائے۔ اور دوسرا یہ کہ ایسا نظام حیات کھوجا جائے جس میں انسان دوستی اور انسانی برادری کا تصور کار فرما ہو۔ زاہد ڈار کی نظمیں محض حال کے تصوراتی عمل اور مسائل کی نشاندہی پر اکتفا کرنے کی بجائے ان مسائل کے خلاف نبرد آزمائی کرتے ہوئے "تہذیبی مراجعت" کا تصور سامنے لاتی ہے۔ مگر یہ تہذیبی مراجعت روایت کا جمودی تسلسل نہیں بلکہ صوفیانہ طرزِ حیات سے مستعار ہے۔ صوفیانہ طرزِ حیات کہ جو بشر کی ذات و حقیقت کا آئینہ ہے اور یہ طرزِ زیست ہر دور میں انسان کے لیے سکون و پناہ کا ذریعہ رہا ہے۔

میں نے سب کو چھوڑ دیا۔
میں لوٹ آیا
خاک سے ناطہ جوڑ لیا، میں گھر آیا
روٹی پانی دودھ اور مکھن
میرا جیون
نانک دیو اور بُلھے شاہ
سیدھی راہ
مجھ کو مٹی پیاری ہے

پیارا ہر نر ناری ہے
دن بھر محنت کرتا ہوں اور راتوں کو سوتا ہوں
میل ملاپ میں خوش رہتا ہوں، تنہائی میں روتا ہوں"[۲۰]

نئی شاعری پر کی گئی تنقید میں اس بات کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے کہ نئے شعرا مغربی شاعری سے بری طرح متاثر ہیں ایسے میں زاہد ڈار کی نظم نئے شعرا میں بھی انفرادیت کا نقش کچھ یوں مستحکم کرتی ہیں کہ وہ مغربی شاعری و فکر کے نمونوں کو قبول کرنے کی بجائے نانک دیو اور بلھے شاہ کو فکر و فن کی رہنمائی کے لیے منتخب کرتے ہیں کیونکہ زاہد ڈار کے نزدیک مغربی ذہانت بشر کو ذہنی بحران اور جذباتی خلفشار سے دوچار کرتی ہے چنانچہ زاہد ڈار صنعتی عہد کے اسلوبِ حیات اور عصر حاضر کی جذباتی پیچیدگی سے رُخ موڑ کر انسانی طبیعت و جذبات کی سادگی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ انیس ناگی کے بقول: " اس کی تہذیبی گھر واپسی اس 'خاک' سے از سر نو تعلق استوار کرنے کی کوشش ہے۔ ملکی اور مقامی تہذیب سے وابستگی ایک خوش آئند ذہنی رویہ ہے مگر زمانہ حاضر کے مسائل اور الجھنوں میں بلھے شاہ اور نانک دیو کی تعلیمات سے کسی نتیجہ خیز حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ زاہد ڈار کے لیے نئے زمانے کا ایک دن گزارنا بھی جوئے شیر لانے کے مصداق ہے کہ اس میں لایعنیت اور نراج ہے"[۲۱]

زاہد ڈار کی نظموں میں ماضی و حال کی کشمکش فکری حوالے سے کوئی واضح نقش مرتب ہونے نہیں دیتی۔ وہ حال کی کربناکی کا ذمہ دار ماضی کی اقدار و روایات کو ٹھہراتے ہیں اور پھر حال کی انہی اذیتوں سے چھٹکارے کی خاطر ماضی کے خالص رنگوں کی طرف رجوع بھی کرتے ہیں۔ چونکہ اذیتوں کے لامتناہی سلسلے میں پیہم جدوجہد بھی بے ثمر نظر آتی ہے چنانچہ مجبوریوں کے حل کے لیے ماضی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے مگر تہذیبی گھر واپسی کے باوجود بھی تنہائی کا رونا مقدر ہے جو اس امر کو واضح کرتا ہے کہ نانک دیو و بلھے شاہ بھی آشوب کے ان لمحوں میں بشر کی اعانت کرنے سے مجبور ہیں۔ چنانچہ تذبذب کی یہ کیفیت زاہد ڈار کے ہاں مزاج کی جذباتیت اور تشدد کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں تصادم کے متعدد در کھلتے ہیں اور عہدِ حاضر کی عقلیت بشر کے فکری استعجاب و انتشار کا حل پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔

بقول انیس ناگی:

" زاہد ڈار میں روایتی صوفیانہ رجحان بڑا قوی ہے۔ عقل سے نفرت، مادی حوالوں کی بے ثمری، انسانی بے بسی اسے نئے ردّ عمل پر مجبور کرتی ہے اور وہ حقیقت کی تلاش معروضی حقائق میں کرنے کی بجائے اس نتیجے پر پہنچا ہے۔"[۲۲]

" دل کے اندر ایک حقیقت چھپی ہے
جس کے آگے اس دنیا کی ساری خوشیاں
ساری خوشیاں
سارے منظر
بے معنی لایعنی ہیں۔"(۲۳)

زاہد ڈار کی میں دل میں نہاں حقیقت کا تصور دراصل حقیقت کا وجدانی و جذباتی تصور ہے۔ یہ تصور اور دیگر رجحانات ان کی نظموں میں صوفیانہ جنون و وجدان کی صورت میں ظہور پاتے ہیں۔ حال و ماضی کا انتشار اور متضاد رویے اس جنون و وحشت میں حواس باختگی سر میں طوفان و ابتری کو اس طرح پھیلاتی ہے کہ آنکھ کے آخری نظارے تک محض ابتری ہی ابتری نظر آتی ہے۔ مگر ان کے ہاں یہی ابتری موت سے تحفظ و پناہ گاہ کا سامان بن جاتی ہے۔

میرا پاگل پن،
مرا ایمان، میری زندگی کا آسرا
میرا پاگل پن مجھے جھوٹے خداؤں کے مظالم، نیک لوگوں کے ترحم سے بچاتا ہے۔
میرا پاگل پن میری کمزوری مجھ سے چھپاتا ہے،
مجھے خودکشی سے روکتا ہے۔۔۔(۲۴)

اردو شاعری کی روایت اور جدید شعرا میں وحشت، جنوں، ابتری واختلال حواس میں اس نوع کے شعور و آگہی کی شعاعیں کسی دوسرے شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ زاہد ڈار کی نظموں میں شاعر کا پاگل پن اور خود بینی کا ثمر "کرب" ناصرف بشر کو زمانے کے بے رحم خداؤں کی کھوکھلی عنایت اور جبر و قہر سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ معاشرتی چیرہ دستیوں کے مقابل ڈھال بھی بن جاتا ہے چناچہ یہ شعوری پاگل پن ان کے ہاں بشر کا مدافعتی حصار ثابت ہوتا ہے۔ زاہد ڈار کی نظموں میں جنوں، ابتری اور وحشت کا یہ تصور عہد جدید کی صورتحال کے ادراک کا نرالا نقش ہے۔ ان کے ہاں وحشت کی ایک انفرادی و شخصی صورت جنسی محرومی، تنہائی اور تشنگی سے بھی وابستہ ہے۔ "محبت اور مایوسی کی نظمیں" اور "تنہائی" میں عورت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ عورت سے جدائی زمانے کے ستائے، دکھوں کے مارے شاعر کی حیات کو عذاب کر دیتی ہے۔ عورت جو سرچشمہ ء حیات ہے اس چشمے سے دوری ایک مستقل تنہائی کو جنم دیتی ہے بقول شاہین مفتی:" تنہائی زاہد ڈار کی نظموں کا ایسا

استعاراتی مظہر ہے جس کے مطالعے سے شاعر کے ابہام، بے معنویت، لاتعلقی اور اجنبیت کی فکری جہتوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ (۲۵) اس تنہائی اور مخصوص عورت کے تجربے نے سلسلہءِ تصوف کے تصورِ فنا کو شاعر پر کچھ انوکھے انداز میں ظاہر کیا ہے:

"کوئی بھگوان کی آواز نہیں سن سکتا
کوئی اس دنیا میں آزاد نہیں رہ سکتا

--- --- ---

جسم پرواز نہیں کر سکتا
روح بیمار نہیں پڑ سکتی
ہاتھ زنجیر نہیں بن سکتا
آنکھ دیوار نہیں بن سکتی

موت آتی ہے اسے اور نہ وہ زندہ ہے
وہ نہ بوجھل، نہ ہلکا ہے، نہ چھوٹا، نہ بڑا
نہ خاموش ہے نہ بولتا ہے
اس کو معلوم ہے سب خالی ہے
جس نے دیکھی ہے تصوف کی کتاب" (۲۶)

ان کی نظموں میں عصری آشوب کا تحفہ تنہائی و اداسی کا دوسرا زاویہ عدم مفاہمت کو محیط ہے کہ شاعر سماجی حوالے سے غیر فعال ہے وہ سماج، فرد اور حقیقت سب سے رشتہءِ مفاہمت استوار کرنے سے قاصر ہے۔ وہ حیات کا چلن بدلنے کا خواہاں مگر حیات کے تاریخی عمل کے مقابل بے دست و پا ہے۔ اس کا ظلم کے خلاف آوازہ صدا بصحرا ثابت ہوتا ہے۔ زندگی کے زندہ محرکات کی جویائی میں اس کا واسطہ لایعنیت سے پڑتا ہے۔ زندگی کی خواہش میں موت کا خوف بشر کا مقدر ہے سو ایسے میں تمام تر بشری جدوجہد کا انجام لاحاصلی و تنہائی ہے۔ زاہد ڈار کی نظمیں اسی فردی و سماجی منظر نامے کی تشکیل ہیں کہ جو عہدِ حاضر کے سب سے بڑے انسانی المیے جدائی و نارسائی سے عبارت ہے۔ جدائی و نارسائی کا یہ زہر تریاق بن سکتا تھا اگر عورت کی مخلص رفاقت نصیب ہوتی مگر ایسا ممکن نہیں۔ چنانچہ زاہد

ڈار کی نظموں میں عورت کی رفاقت و طلب جب نارسائی سے دوچار ہوتی ہے تو ان کی نظمیں برملا جنسی 'اظہار' سے دہشت انگیزی پیدا کرتی ہیں۔ اور جنسی خواہش کا اظہار غیر امتناعی طریقے سے ہوتا ہے، "چوہانامہ" اور "جنسی بھوک" اس کی مثال ہیں۔

زاہد ڈار کی نظمیں عصری و بشری آشوب کی پیشکش میں متنوع رویوں سے مستعار ہیں۔ وہ کہیں معاشرتی ناہمواریوں پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ کبھی بشر کی تقدیر اور سماجی حیثیت کے سبب خود ترسی و جذباتی صورتحال کو سامنے لاتے ہیں تو، کہیں مبلغ کے روپ میں محبت، سادگی، انسان دوستی کا جھنڈا اٹھاتے ہیں۔ ان کی تبلیغ کا یہ انداز نئے شعری و جذباتی انداز کے برعکس تجربات کے براہ راست بیان کے ذریعے معنی آفرینی کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ ان کی نظمیں مروجہ شعری روایت کے مخصوص انداز اور نئے شعرا کے ابہام، پیچیدگی، تجربات کے گنجلک سلسلوں، زبان کی شکست و ریخت اور سابقہ تصور معانی کی تردید کے بجائے سریع الفہمی اور ترسیل معانی کو اہمیت دیتی ہیں۔ فوری ابلاغ و افہام کے پیش نظر زاہد ڈار کے ہاں زبان خطِ مستقیم میں سفر کرتی نظر آتی ہے۔ جہاں لفظوں کی لغوی دلالتیں معانی کی آخری شکل معلوم ہوتی ہیں مگر معانی کی ترسیل سے تکمیل تلک بشری و سماجی صورتحال کے ان گنت زاویے شاعر کی علمی وسعتوں اور ادراکی صلاحیتوں کے پرت کھولتے ہیں اور صاحبِ علم بظاہر ان سادہ فہم نظموں میں عالمی و کائناتی صورتحال کا عکس دیکھتا ہے۔۔ زاہد ڈار نے ماضی کے شعری اثرات کو قبول کرنے کے باوجود اپنی انفرادیت بھی منوائی ہے۔ مروجہ معاشرتی اقدار کے خلاف بغاوت کا رجحان اور صنعتی معاشرے میں استحصال کا شکار ہونے والے مرد و عورت کی پیش کش ان کی نظموں میں مروجہ روایت سے مختلف ہے۔ ان کی نظمیں مروجہ شاعری کے جذباتی ردّعمل اور محدود فکر دونوں سے گریزاں ہیں۔ انہوں نے تخلیقی تجربات کی اکہری و ظاہری سطح کے ذریعے معانی کے اسلوب سے تجریدی عناصر کو خارج کرکے شاعری کو ناصرف سریع الفہم کیا ہے بلکہ اسے ایک سچے فنکار کے داخلی کرب کا وسیلہ بھی ٹھہرایا ہے۔ عصرِ جدید میں انسانی ابتری کے پر آشوب لمحے ان کی نظموں میں سانس لیتی تصویر بن جاتے ہیں اور یہ تصویر فقط زاہد ڈار کا فکری عکس نہیں بلکہ تمام انسانی سماج کا باطن ہے کہ جو اپنے چہرے سے مصلحتوں کا نقاب اتار کر جب عیاں ہوتا ہے تو زاہد ڈار کی نظموں کا آئینہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسی جنون، وحشت اور جذب و مستی کے سہارے نہ صرف نئے استفسارات جنم لیتے ہیں بلکہ حالات سے نبرد آزما ہو کر زندگی کے عمل میں موت و حیات دونوں سے بیک وقت برسرِپیکار ہونے کا حوصلہ بھی نظر آتا ہے۔ یوں ان کی نظمیں جہاں کائناتی و سماجی آشوب کے لمحوں میں ایک بے ضرر سچے انسان کی بے بسی کو مجسم کرتی ہیں وہیں آنے والے زمانوں میں

انسانی تخریب کے ہاتھوں مٹتی ہوئی انسانی وفطری حیات کی خبر داری بھی ثابت ہوتی ہیں کہ اگر اب بھی سنبھالا نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ جب کائنات کی سب سے قیمتی ہستی یعنی 'انسان' صفحہ ءِ ہستی سے خود اپنے ہی ہاتھوں مٹ جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ انیس ناگی "نیا شعری افق" لاہور: عالمی پرنٹنگ پریس، سن ندارد، ص ۱۶۱، ۱۶۲

۲۔ زاہد ڈار "تنہائی" لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶، ص ۲۳۰، ۲۲۹

۳۔ زاہد ڈار "درد کا شہر" لاہور: نئی مطبوعات بار اوّل مارچ ۱۹۶۵، ص ۴۷

۴۔ زاہد ڈار "آنکھ میں سمندر" (انتخاب) دیباچہ از شمیم حنفی، نئی دہلی: نئی آواز جامع نگر، بار اوّل ستمبر ۱۹۸۷، ص ۵

۵۔ ایضاً ص ۶

۶۔ زاہد ڈار "درد کا شہر" ص ۵۹

۷۔ انیس ناگی "نیا شعری افق" ص ۱۶۴

۸۔ زاہد ڈار "درد کا شہر" ص ۵۵

۹۔ انیس ناگی "نیا شعری افق" ص ۱۶۵

۱۰۔ زاہد ڈار "درد کا شہر" ص ۳۴

Article ‘ Zahid Dar , the outsider of Lahore’s literary landscape , passes away’.11 published in ‘ Dawn’ February 14th, 2021

۱۲۔ خط بنام شاہین مفتی، مشمولہ "جدید اردو نظم میں وجودیت" از شاہین مفتی 'لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۱ ص ۳۸۷

۱۳۔ صائمہ ارم :ڈاکٹر، مضمون "زاہد ڈار : ایک دستیاب شخص" , facebook page , Saima Iram، ۲۲ نومبر ۲۰۲۱، ۱۰:۴۱

۱۴۔ زاہد ڈار "درد کا شہر" ص ۳۶

۱۵۔ ایضاً ص ۴۹

۱۶۔ زاہد ڈار "تنہائی" ص ۲۶۳، ۲۶۴

۱۷۔زاہد ڈار "آنکھ میں سمندر"ص ۱۵
۱۸۔زاہد ڈار "آنکھ میں سمندر"ص ۲۳
۱۹۔زاہد ڈار "درد کا شہر"ص ۵۸
۲۰۔زاہد ڈار "آنکھ میں سمندر"ص ۱۷،۱۶
۲۱۔انیس ناگی "نیا شعری افق"ص ۱۶۸
۲۲۔ایضاً ص ۱۷۰
۲۳۔زاہد ڈار "درد کا شہر"ص ۶۳
۲۴۔ایضاً ص ۴۶
۲۵۔انیس ناگی "نیا شعری افق"ص ۲۷
۲۶۔زاہد ڈار "تنہائی"ص ۱۹۴،۱۹۵